بنیاد جلد ۵، ۲۰۱۴ء

معین الدین عقیل

معین الدین عقیل *

اردو زبان و ادب پر گارسیں دتاسی کے احسانات: اوّلین تاریخ ادب اردو

جنوبی ایشیا میں ادب اور بالخصوص اردو زبان و ادب کی تاریخ نویسی نوآبادیاتی دور کا ثمر ہے جب جدید علوم کے اثرات سے ہمارہ معاشرہ فیض پانے کے قابل ہو رہا تھا اور زبان اور ادب کی نوعیت اور اس کے معیار کا تعین بھی معاشرے کے محرکات اور تقاضوں کے مطابق کیا جانے لگا تھا۔ تاریخ نویسی کا عمل قبل ازیں محض سیاسی واقعات کو محفوظ کرنے یا ترتیب دینے یا اکابر کی سوانحات تحریر کرنے تک محدود تھا۔ اس عمل میں مملکتوں اور حکمرانوں کے احوال تو ہماری روایتی تاریخوں میں خوب جگہ پاتے رہے، اور اگرچہ کچھ بہت مبسوط اور جامع تاریخیں لکھی گئیں تو ان میں سیاسی مدبروں، دانش وروں، اور علما و شاعروں کے احوال بھی شامل ہوتے رہے۔ اسی عمل کے ذیل میں تذکرہ نویسی نے فروغ پایا جس میں رفتہ رفتہ تحقیق وتنقید کے عناصر بھی گاہے گاہے جگہ پاتے رہے۔ یہی عناصر بعد میں ادبی تاریخ نویسی کے عمل میں، اس کا معیار بنتے رہے ہیں۔

تاریخ، تحقیق اور تنقید کا باہمی امتزاج اور اشتراک ہمیں ابتدا میں شعرا کے معیاری تذکروں میں نظر آتا ہے جس کے زیرِ اثر تذکرہ نگار، شعرا کا کلام منتخب کرتے رہے اور کہیں کہیں ان کی شخصیت اور ان کے ذوق وفن کی جانب اشارے بھی کرتے رہے۔ پھر ان میں گاہے تحقیقی اور تاریخی شعور بھی نظر

آتا ہے۔ابتدائی تذکرہ نگاروں میں قائم (مخزن نکات، ۱۱۶۸ھ/۱۷۵۱ء) اور میر حسن (تذکرہ شعراے اردو، ۱۱۹۱ھ/۱۷۷۴ء) وہ تذکرہ نگار تھے جنھوں نے اپنے تذکروں میں شعرا کو اس وقت کے عام رواج کے مطابق، حروف تہجی یا کسی بے ترتیبی کے بجائے متقدمین، متوسطین اور متاخرین (یا معاصرین) جیسے ادوار میں تقسیم کر کے اپنے نیم پختہ سے تاریخی شعور کا اظہار کیا ہے۔قدرت اللہ شوق کا تذکرہ طبقات الشعرا (۱۱۸۹ھ/۱۷۷۴ء) اس شعور میں کچھ اضافے کا پتا دیتا ہے۔میر حسن نے اگرچہ شاعروں کو حروف تہجی ہی کے اعتبار سے شامل کیا لیکن پھر اسی ترتیب میں انھوں نے مذکورہ طبقات وضع کیے تھے، جب کہ قائم نے حروف تہجی کے بجائے مذکورہ تاریخی ترتیب کو ملحوظ رکھا تھا۔شوق نے کچھ آگے بڑھ کر اس ترتیب کو زمانی اور طبقاتی اور کچھ موضوعاتی لحاظ سے بھی تقسیم کیا، لیکن یہ کوشش خام سے زیادہ نہیں اور شعرا کو اس طرح طبقاتی، زمانی و تاریخی نسبت کے لحاظ سے ترتیب دیا ہے کہ یہ عمل ان شعرا کے ساتھ اور ان کے عہد کے ساتھ زیادتی سے کم نہیں۔یعنی معاصرین کو بھی انھوں نے زمانی اعتبار سے تقسیم کر دیا جو یا تو معلومات کی کمی کے باعث ہوا یا تاریخی شعور کے فقدان کی وجہ سے ہوا۔

واقعہ یہ ہے کہ اس وقت تک تذکروں میں گلشن بے خار (۱۸۳۵ء) واحد اور جامع تذکرہ ہے جس میں تذکروں کی قدیم مسلمہ روایت کے ساتھ ساتھ تنقید اور معیار کو بھی اہمیت حاصل ہوتی نظر آتی ہے۔جو اسی روایت کے تسلسل میں کوئی نصف صدی کے بعد آب حیات میں یکجا ہو جاتی ہے، جس میں اب شعرا کے تذکرے کے ساتھ ساتھ لسانی تحقیق، ادبی تنقید اور تاریخ اور سوانح نگاری کے ابتدائی نمونے بھی ملتے ہیں۔اسی بنا پر یہی ہماری تاریخ نویسی کا آغاز ہے اور تنقیدی شعور اور تحقیق جستجو کے باعث اب تذکرہ نگاری تاریخ نویسی میں ضم ہو جاتی ہے۔یوں تذکرے بعد میں بھی، یعنی بیسویں اور اکیسویں صدی میں بھی لکھے جاتے ہیں اور اس طرح یہ روایت یکسر ختم تو نہیں ہوتی لیکن نوعیت اور مقصد اب مختلف ہے اور اہمیت تاریخ نویسی کو حاصل ہے۔

نو آبادیاتی عہد کے دور اول (۱۸۵۷ء) تک تذکروں میں تاریخی اور تنقیدی شعور کا نسبتاً بہتر اظہار مولوی کریم الدین کے تذکرہ طبقات الشعراے ہند (۱۸۴۸ء) سے نظر آنے لگتا ہے، جس

بنیاد جلد ۵، ۲۰۱۴ء

کو تاریخی و تنقیدی احساس کا حامل ایک زیادہ بہتر تذکرہ کہا جا سکتا ہے اور چونکہ اس کا محرک اور اس کی بنیاد گارسیں دتاسی کی تاریخ ادبیات ہندوی و ہندوستانی تھی، جو دراصل تذکرہ بلکہ تاریخ شعرا ہی ہے اور اس وقت، جب کہ یورپ میں بھی ادب کی تاریخ دراصل شاعری ہی کی تاریخ سمجھی جاتی تھی، گارسیں دتاسی کی تاریخ واقعتاً ہمارے تذکروں کی ایک زیادہ مکمل، ضخیم اور ترقی یافتہ صورت ہے اور ایک لحاظ سے ہماری تذکرہ نویسی کے دور میں ادبی تاریخ نویسی کی سب سے پہلی کوشش بھی ہے لیکن جنوبی ایشیا میں نہیں یورپ (پیرس، فرانس) میں۔

گارسیں دتاسی (۱۷۹۴ء۔۱۸۷۸ء) بلاشبہ انیسویں صدی کے مستشرقین میں اس اعتبار سے سب سے نمایاں اور ممتاز ہے کہ اردو تحقیق اور مطالعۂ اسلام کے ضمن میں اس کے تحقیقی مطالعات نے اپنے موضوعات پر ایسا ذخیرۂ مآخذ فراہم کر دیا ہے کہ جن سے استفادے کے بغیر اردو زبان و ادب اور ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ و تہذیب کا کوئی مطالعہ، خصوصاً انیسویں صدی کے تعلق سے، جامع اور مستند نہیں ہو سکتا۔وہ ایک کثیر التصانیف محقق و مصنف تھا اور سب کچھ فرانسیسی زبان میں لکھتا رہا۔اس کی محض چند کتابیں، اس کے انتقال کے کوئی نصف صدی کے بعد ہی کسی زبان میں منتقل ہونا شروع ہوئیں یا پھر ہمارے دانشوروں اور محققین و مصنفین نے اپنے ذوق و شوق اور اپنے مطالعات کے سلسلے میں جب خصوصاً فرانس میں وقت گذارا تو اردو کے تعلق سے اس کی تحقیقات سے واقفیت حاصل ہونے اور ان کی افادیت و اہمیت کو سمجھنے کی وجہ سے اردو زبان میں ان کے ترجموں کو ضروری سمجھا اور یوں اس کے خطبات اور تمہیدی خطبات جیسے مجموعوں کی صورت میں اس کی تحقیقات بیسویں صدی کے تیسرے اور چوتھے عشروں میں اردو میں منتقل ہوئیں اور اردو محققین کے لیے اہم مآخذ ثابت ہوئیں۔پھر یہی مجموعے قدرے ترمیم و تصحیح کے ساتھ سن ساٹھ اور ستر کی دہائی میں شائع ہوئے۔

اس عمل کے دوسرے مرحلے میں اس کی بعض تصانیف کو، جو اردو زبان و ادب کے لیے مآخذ کی حیثیت رکھتی ہیں، جیسے اردو شعرا کے تذکروں پر اس کے مطالعات جنھیں اولاً منشی ذکاء اللہ دہلوی (۱۸۳۲ء۔۱۹۱۰ء) نے اردو میں ترجمہ کیا اور بعد میں اسے اضافی معلومات کے ساتھ ڈاکٹر تنویر احمد علوی (پ: ۱۹۲۵ء) نے مرتب و شائع کیا۔اسی کام کو ڈاکٹر ریاض الحسن (۱۹۰۲ء۔۱۹۸۲ء) نے بھی انجام

دیا۔ یہ سب ہوا لیکن افسوس کہ اردو تحقیق کے ضمن میں دتاسی کی سب سے اہم تصنیف، اس کی تاریخ ادبیاتِ ہندوی و ہندوستانی (*Histoire de la Litterature Hindouie et Hindoustanie*)، جو اولاً ۱۸۳۹ء میں، اور پھر ۱۸۴۷ء میں (بطور جلد دوم) اور بعد میں بہت قیمتی و تازہ اضافوں کے ساتھ ۱۸۷۰ء اور ۱۸۷۱ء میں شائع ہوئی، لیکن اپنی اشاعت کے ۹۰ سال گذرنے اور اردو زبان و ادب کا انتہائی ناگزیر ماخذ ہونے کے باوجود نہ انگریزی میں اور نہ اردو میں ترجمہ ہو کر منظرِ عام پر آئی، جب کہ دتاسی کی مذکورہ تصنیف (تذکرۂ شعرا) سے قطعِ نظر اس کے سارے ہی خطبات کو مذکورہ بالا صورتوں میں مولوی عبدالحق (۱۸۷۰ء۔۱۹۶۱ء) نے انجمن ترقیِ اردو، اورنگ آباد کے تحت اہتمام سے ترجمے کروا کے شائع کروادیا تھا۔ اسی طرح کا اہتمام اس وقیع تصنیف کے لیے بھی ضروری تھا۔ بہر حال اس کا ترجمہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی (۱۹۱۶ء۔۱۹۹۴ء) کی مرضی سے شعبۂ اردو، جامعہ کراچی کے تحت ۱۹۶۰ء میں ایک فرانسیسی خاتون لیلیان سیکتیں نازرو نے راست فرانسیسی زبان سے اردو میں کیا، جس کے بارے میں ضروری تفصیلات ذیل میں دیکھی جاسکتی ہیں، لیکن پھر بھی مزید نصف صدی گذر جانے کے باوجود یہ ترجمہ تا حال شائع نہ ہوا۔

یہ ترجمہ پی ایچ ڈی کی سند کے حصول کے مقصد سے امتحان کے رسمی تقاضوں کے مطابق کراچی یونی ورسٹی میں ۱۹۶۰ء میں پیش کیا گیا تھا۔ مترجمہ فرانسیسی تھیں۔ نامور محقق اور عالم ڈاکٹر محمد حمید اللہ (۱۹۰۹ء۔۲۰۰۲ء) کی وجہ سے، جو ایک عرصے سے پیرس میں مقیم تھے، ان میں اردو زبان سے رغبت پیدا ہوئی اور انھوں نے اردو سیکھی اور پیرس کی سوبورن یونی ورسٹی اور ادارۂ السنۂ شرقیہ سے فارغ التحصیل ہوئیں۔ روایت ہے کہ وہ وہاں سفارت خانۂ پاکستان میں ملازمت کے باعث یا کسی اور حیثیت میں وابستہ تھیں۔ پھر پاکستان کے سابق وزیر اعظم حسین شہید سہروردی (۱۸۹۳ء۔۱۹۶۳ء) کی وساطت سے تعلیمی وظیفے پر یہ پاکستان آئیں اور کراچی یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو سے، بغرضِ حصولِ سند پی ایچ ڈی، منسلک ہو کر یہ کام کیا، جس کے نگران ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی مقرر ہوئے۔ مجلسِ اعلیٰ تعلیم و تحقیق (Board of Advance Studies and Research)، جامعہ کراچی کے اجلاس، مؤرخہ ۲۸ ستمبر ۱۹۶۰ء میں قرارداد نمبر ۱۰ کے تحت اس خاتون کا داخلہ پی ایچ ڈی میں اس سابقہ تاریخ سے منظور ہوا،

جب اس خاتون نے ڈاکٹر لیث صاحب کے ساتھ کام شروع کیا تھا۔ مقالے کے ممتحن ڈاکٹر یوسف حسن خاں (پرووائس چانسلر، کراچی یونی ورسٹی)، ڈاکٹر عزیز احمد (لندن، معروف ناول و افسانہ نگار اور محقق) اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی مقرر ہوئے۔ زبانی امتحان کے لیے ڈاکٹر یوسف حسن خاں اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا نام تجویز ہوا تھا لیکن کسی وجہ سے ڈاکٹر یوسف حسن خاں کی معذرت کے سبب ان کی جگہ ایف اے کریم فضلی ممتحن نامزد ہوئے۔ ان ممتحنین کی سفارش کے نتیجے میں مؤرخہ ۱۶ جنوری ۱۹۶۱ء کے اجلاس میں اس خاتون کو کامیاب قرار دے کر پی ایچ ڈی کی سند دینا منظور کر لیا گیا۔

بظاہر محض کسی کتاب کا ترجمہ اس سند کے لیے قابلِ قبول نہ ہوسکتا تھا اس لیے مترجمہ نے ترجمے میں مصنف کے بیانات کی تصدیق و توثیق کے لیے ہم عصر مآخذ سے، جن کے حوالے خود مصنف نے متن میں دیے تھے، اسناد پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور مصنف نے جن مقامات پر معلومات تشنہ چھوڑ دی تھیں کہیں کہیں وہاں متعلقہ معلومات کو حواشی میں تحریر کیا ہے یا جن شعرا کے اشعار کا حوالہ مصنف نے دیا تھا یا ان کے ترجمے فرانسیسی میں کیے تھے، لیکن اشعار نقل نہیں کیے تھے، مترجمہ نے متعلقہ مآخذ سے ایسے متعدد اشعار کو اخذ کر کے متن ہی میں انھیں شامل کر دیا ہے یا اگر وہ اشعار دستیاب نہ ہوئے تو وہاں معذوری ظاہر کر دی ہے۔ جہاں کہیں ضروری محسوس ہوا وہاں نثری عبارتیں بھی نقل کی ہیں۔ یہ سب مترجمہ کے کیے ہوئے ایسے اضافے ہیں جو اصل فرانسیسی متن میں موجود نہیں۔

مترجمہ نے اپنی جانب سے ایک اور مزید کوشش یہ کی ہے کہ اپنے تحریر کردہ 'تعارف' کے آخر میں ان مآخذ کی ایک فہرست بھی درج کر دی ہے جنھیں مصنف نے پیشِ نظر رکھ کر یہ کتاب تصنیف کی تھی۔ اس فہرست میں دیکھا جاسکتا ہے کہ مترجمہ نے ان مآخذ کی وہ اشاعتیں درج کی ہیں جو اس کے اپنے پیشِ نظر رہیں، جب کہ مصنف کے سامنے تو ان میں سے اکثر مآخذ اس وقت تک غیر مطبوعہ تھے۔

مترجمہ نے جہاں متن یا حواشی میں مغربی نام تحریر کیے ہیں وہاں انھیں اردو میں لکھنے کی پوری کوشش کی ہے لیکن متعدد مقامات پر نام رومن ہی میں رہنے دیے ہیں۔ اس کی ایک وجہ بظاہر ان ناموں کا تلفظ بھی ہوسکتا ہے جن کو اردو میں لکھنا مترجمہ کے لیے ممکن نہ رہا ہوگا۔ مترجمہ نے گارسیں دتاسی کے نام کا املا 'گارساں دتاسی' کیا ہے لیکن ڈاکٹر محمد حمید اللہ (۱۹۰۹ء۔۲۰۰۲ء) نے، جو فرانسیسی

زبان میں کامل مہارت رکھتے تھے، ’گارساں‘ کے لیے ’گارسیں‘ تلفظ پر اصرار کیا ہے ،اس لیے جہاں جہاں مصنف کے نام کو راقم نے تحریر کیا ہے وہاں ’گارسیں‘ لکھنے کو ترجیح دی ہے ۔

اس ترجمے کا جو مسودہ دستیاب ہے،اس میں جگہ جگہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی مرحوم کے قلم سے اضافے اور تصحیحات موجود ہیں۔اگرچہ مترجمہ لیلیان نازرو ہیں لیکن اکثر مقامات پر بامحاورہ زبان، روزمرہ تراکیب اور زبان کے فطری لب و لہجے کو دیکھ کر گمان غالب ہوتا ہے کہ زبان و بیان ہر جگہ مترجمہ کا نہیں، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا قلم صاف جھلکتا ہے اور اکثر مقامات پر یہ یقین ہوتا ہے کہ یہ زبان یا اسلوب مترجمہ کا نہیں ہوسکتا۔متعدد مقامات ایسے بھی دیکھے جاسکتے ہیں کہ جہاں زبان کسی غیر اہلِ زبان کی ہو نہیں سکتی۔پھر ایک اور امر بھی قابلِ مشاہدہ ہے کہ زبان اور اسلوب ہر جگہ یکساں نہیں، کہیں کہیں گمان گذرتا ہے، اور حقیقت سے قریب بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ سارا ترجمہ اور اس کا اسلوب و بیان محض مترجمہ کے نہیں اور کسی ایک نہیں بلکہ کم از کم دو افراد کی کوششوں پر منحصر ہیں۔پھر حواشی اور ’تنقید بر حاشیۂ مصنف‘ کے ذیل میں کچھ ایسی ادبی معلومات بھی ترجمے میں شامل ہیں جن کے بارے میں بھی یہ یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ ایسی معلومات کا پیش کرنا کسی غیر زبان کے اس سطح کے کسی فرد کے لیے ممکن نہ تھا۔یہ معلومات اردو ادب کے نہایت گہرے اور وسیع مطالعے کا ثمر ہوسکتی ہیں۔

اس تصنیف اور اس ترجمے سے قطع نظر اس کا مصنف ہمارے لیے اس اعتبار سے اہم اور قابلِ ستائش ہے کہ اس کا نام ایسے مستشرقین میں شامل ہے جو جنوبی ایشیا کبھی نہ آئے لیکن اپنے ملک میں رہ کر اردو زبان و ادب کے مطالعہ و تحقیق میں جستجو اور انہماک، مستقل مزاجی اور محنت و لگن کا ثبوت دیا، ان میں فرانس کے گارسیں دتاسی[1] کا نام، خصوصاً انیسویں صدی کے مستشرقین میں، سب سے مختلف اور نمایاں کہا جاسکتا ہے۔ایک ایسے دور میں جب اردو زبان علمی زبانوں کی صف میں ابھی شامل نہ ہوئی تھی، نہ اس کی معیاری لغات اور قواعد مرتب ہوئی تھیں، نہ یہ تدریسی زبان بنی تھی اور نہ علمی ذریعۂ اظہار کے قابل سمجھی گئی تھی، نہ اس کی تاریخ کے ارتقائی مدارج اور مراحل کو سمجھنے کا کوئی واضح شعور موجود تھا، نہ ہی اس کے ادب کی تاریخ مرتب کرنے کا کسی کو احساس رہا، ایسے وقت میں گارسیں دتاسی اس زبان کے مطالعہ و تحقیق کی جانب اس طرح متوجہ ہوتا ہے کہ اپنی ساری زندگی اس کے لیے وقف کردیتا

ہے۔وہ اس زبان کی روز افزوں مقبولیت اور ترقی کا اندازہ لگا کر اسے اپنی توجہ کا مرکز بنا لیتا ہے اور اس زبان کو ترقی یافتہ زبانوں کی صف میں دیکھنے کا آرزومند رہتا ہے۔[2]

اس کی شخصیت، حالاتِ زندگی، اس کے علمی انہماک، اس کی اردو خدمات اور اس کی تصانیف وتالیف کے جائزے و مطالعے پر مشتمل متعدد کوششیں اردو زبان میں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔[3] مثلاً مذکورہ موضوعات پر درج ذیل مآخذ مبسوط معلومات فراہم کرتے ہیں:

۱۔ محی الدین قادری زور، گارساں دتاسی اور اس کے ہم عصر بہی خواہانِ اردو (حیدرآباد،۱۹۴۱ء اور۱۹۴۷ء)۔

۲۔ ثریا حسین، گارسیں دتاسی: اردو خدمات، علمی کارنامے (لکھنؤ،۱۹۸۴ء)۔

۳۔ قاضی عبدالودود، گارساں دتاسی (پٹنہ،۱۹۹۵ء)۔

ان مبسوط مطالعات کے علاوہ، جن میں سے آخر الذکر مختلف وقتوں میں لکھے گئے مقالات کا مجموعہ ہے، دیگر مآخذ میں سے درج ذیل مقدمات، پیش لفظ، مقالات اور کتابیں بھی قیمتی معلومات پر مشتمل ہیں:

۱۔ عبدالحق، ’’مقدمہ‘‘مشمولہ خطباتِ گارساں دتاسی (اورنگ آباد،۱۹۳۵ء، اشاعتِ دوم،کراچی،۱۹۶۴ء)۔

۲۔ محمد حمید اللہ، ’’اختتامیہ‘‘مشمولہ مقالات گارسیں دتاسی جلد اول (کراچی،۱۹۶۴ء)۔

۳۔ آغا افتخار حسین،یورپ میں تحقیقی مطالعے (لاہور،۱۹۶۷ء)۔

۴۔ آغا افتخار حسین،یورپ میں اردو (لاہور،۱۹۶۸ء)۔

۵۔ تنویر احمد علوی،’’مقدمہ‘‘مشمولہ رسالۂ تذکرات مصنف گارسیں دتاسی،مترجم مولوی ذکاء اللہ دہلوی (دہلی،۱۹۶۸ء)۔

۶۔ رضیہ نور محمد، اردو زبان و ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ (لاہور،۱۹۸۵ء)۔

۷۔ سلطان محمود حسین، تعلیقاتِ خطبات گارسیں دتاسی (لاہور،۱۹۸۷ء)۔

۸۔ ''تعلیقاتِ خطباتِ گارساں دتاسی'' تبصراتی مقالہ، معین الدین عقیل، مشمولہ اردو تحقیق: صورتِ حال اور تقاضے (اسلام آباد، ۲۰۰۸ء)۔

گارسیں دتاسی کی ان تصانیف پر، جن کا تعلق اردو زبان و ادب سے ہے، مفصل معلومات ثریا حسین نے اپنے مذکورہ بالا مبسوط مقالے میں یکجا کردی ہیں اور اس کی تمام تصانیف و تالیفات کی ایک جامع فہرست بھی اپنے مقالے کے آخر میں شامل کردی ہے، جن کی مجموعی تعداد ۱۵۵ ہے۔ان سے قطعِ نظر گارسیں دتاسی کی جو تصانیف اردو میں ترجمہ ہوئیں، وہ یہ ہیں:

۱۔ تذکرہ طبقات الشعرامے ہند مولفہ مولوی کریم الدین پانی پتی (دہلی، ۱۸۴۷ء)؛ دتاسی کی تصنیف تاریخ ادبیاتِ ہندوی وہندوستانی (*Histoire de la Litterature Hindouie et Hindoustanie*) (پیرس، ۱۸۳۹ء) سے ماخوذ معلومات پر مشتمل، جن کو فرانسیسی سے ایف فیلن (F. Fallon) نے انگریزی میں اور مولوی کریم الدین نے انگریزی سے اردو میں منتقل کیا۔[۴]

۲۔ تذکرات گارساں دتاسی ترجمہ: مولوی ذکاءاللہ دہلوی (دہلی، ۱۸۵۴ء)؛ اس کتاب کو ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے اپنے حواشی کے ساتھ مرتب کر کے شائع کیا۔(رسالۂ تذکرات، دہلی، ۱۹۶۸ء)۔

۳۔ تذکرہ مختصر احوال مصنّفین ہندی مولوی ذکاءاللہ دہلوی نے اصل تصنیف (*Les Auteurs Hindoustanis et Leurs Ouvrages*) (پیرس، ۱۸۵۵ء) سے اردو میں ترجمہ کیا (دہلی، ۱۸۵۵ء)؛ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن گارسیں دتاسی نے (*Les Auteurs Hindoustanis et Leuvres Ouvrages d'apres les Biographies Originales*) کے نام سے مرتب کیا، تو اس کے ایک جز کا ترجمہ ڈاکٹر ریاض الحسن نے اردو کے تذکرے کے عنوان سے شائع کیا۔مشمولہ اردو کراچی (جنوری ۱۹۵۰ء)۔

۴۔ خطبات گارساں دتاسی، مذکورہ بالا۔

۵۔ مقالات گارساں دتاسی، بہ تصحیح ڈاکٹر محمد حمیداللہ (کراچی، ۱۹۷۵ء)۔

۶۔ تمہیدی خطبے، بہ تصحیح ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (دہلی، ۱۹۴۱ء)۔

گارسیں دتاسی نے اردو زبان و ادب کے تعلق سے جو کام کیے، انھیں ان درج ذیل اقسام کے تحت دیکھا جاسکتا ہے:

۱۔ فرانسیسی زبان میں اردو زبان و ادب سے متعلق تحریریں،

۲۔ اصل اردو متون کی ترتیب و تدوین، اور

۳۔ اردو کتابوں اور تحریروں کے تراجم، فرانسیسی زبان میں۔

یہاں اس جائزے میں ۲ اور ۳ سے ہمیں غرض نہیں۔فرانسیسی میں گارسیں دتاسی نے اردو زبان و ادب سے متعلق جو کتابیں یا مقالات تحریر کیے، ان میں معلومات کی فراوانی کے لحاظ سے اس کے وہ خطبات اہم ہیں جو وہ ۱۸۵۰ء سے ۱۸۷۷ء تک ہر سال دیا کرتا تھا اور جو اردو میں خطباتِ گارساں دتاسی کے عنوان سے انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد سے ۱۹۳۵ء میں، مقالاتِ گارساں دتاسی کے نام سے دہلی سے ۱۹۴۳ء میں اور پھر کراچی سے ۱۹۶۴ء میں شائع ہوئے۔پھر تمہیدی خطبات کے نام سے بھی اس کے ابتدائی سالوں کے خطبات دہلی سے ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئے۔ان سب سے قطعِ نظر تاریخ ادبیاتِ ہندوی و ہندوستانی (*Histoire de la Litterature Hindouie et Hindoustanie*) اس کا سب سے اہم کارنامہ ہے۔اس نے یہ تاریخ ۱۸۳۹ء میں مکمل کی، لیکن وہ اس حد تک اس کے لیے مواد جمع کرچکا تھا کہ وہ سارا دستیاب شدہ مواد اس جلد میں سمیٹ نہ سکا، چنانچہ اس نے جب اس کتاب کو اشاعت کے لیے دیا تو اسے جلد اول قرار دینا مناسب سمجھا اور پھر مزید مواد کی فراہمی و ترتیب میں مصروف رہا۔پہلی جلد کے اختتام تک مزید حاصل شدہ مواد اور پھر بعد میں موصولہ مواد کو ترتیب دے کر اسے اس نے دوسری جلد کے طور پر ۱۸۴۷ء میں شائع کردیا۔لیکن یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوا، وہ مسلسل مواد جمع کرتا رہا اور اسے اپنے خطبات کی صورت میں ہر سال مرتب اور پیش کرتا رہا۔پھر اس نے اپنی تاریخ کی کسی اگلی جلد یا جلدوں کی اشاعت سے بہتر یہی سمجھا کہ کل دستیاب مواد کو اب ایک مزید ضخیم تاریخ کے طور پر مرتب کرنا چاہیے۔اس طرح اس کی یہ تاریخ ۲۳ سال کے بعد تین جلدوں میں شائع ہونا شروع ہوئی۔چنانچہ اس کی پہلی اور دوسری

جلد ۱۸۷۰ء میں اور تیسری ۱۸۷۱ء میں شائع ہوئی۔

اس تاریخ کی اولین اشاعت کی پہلی جلد ۱۸۳۹ء میں پیرس سے 'مجلس تراجم شرقیہ برطانیہ عظمیٰ و آئرلینڈ' Oriental Translation Committee, Great Britain and Ireland کے زیرِ اہتمام شائع ہوئی تھی۔ اس پہلی جلد کا ذیلی عنوان سوانحات اور کتابیات (Biographieet Bibliographie) سرورق پر تحریر تھا، جس سے اس جلد کے موضوع اور مندرجات کی وضاحت ہوتی ہے۔ گارسیں دتاسی نے اس کا انتساب مورخہ ۱۵ اپریل ۱۸۳۹ء کو تحریر کیا تھا، جو ملکۂ برطانیہ کے نام تھا۔ پھر اس کا پیش لفظ تحریر کیا ہے، جو ۱۶ صفحات پر محیط ہے۔ اس پیش لفظ کے اہم مطالب کا خلاصہ قاضی عبدالودود نے اردو میں تحریر کیا تھا۔[5] اس کے بعد شاعروں و مصنفین کا تذکرہ ہے جو رومن حروف تہجی میں A سے Z تک ہے۔ یہ متن کل ۵۵۴ صفحات پر مشتمل ہے، پھر ضمیمہ ہے جو تذکروں کے تعارف اور کتابیات پر مشتمل ہے اور یہ صفحہ ۵۵۵ سے ۶۰۵ تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کے بعد اشاریہ ہے جو اشخاص کے لیے صفحہ ۶۰۷ سے ۶۱۷ تک اور اسماے کتب کے لیے ۶۱۸ سے ۶۳۰ تک محیط ہے۔ اس آخری صفحہ پر فرانسیسی زبان میں "پہلی جلد کا اختتام" تحریر ہے۔[6]

دوسری جلد اسی عنوان سے ۱۸۴۷ء میں مجلس مذکورہی کے اہتمام سے پیرس سے شائع ہوئی۔ یہ کل ۶۰۸ صفحات پر مشتمل تھی۔ سرورق کی پشت یا صفحہ ۲ پر ایک عبارت فرانسیسی میں تحریر ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ کتاب ایسٹ انڈیا کمپنی (۷۰۔ لیڈن ہال اسٹریٹ، لندن) کی اجازت سے سرکاری مطبع پیرس سے شائع کی جارہی ہے۔ سرورق کے بعد ۲۰۲ صفحات پر مشتمل پیش لفظ ہے جس میں گارسیں دتاسی نے ہندی اور اردو شاعری کی اصناف کا تعارف حروف تہجی کی ترتیب سے تحریر کیا ہے اور پھر صنائع و بدائع اور ادبی اصطلاحات پر روشنی ڈالی ہے۔ اس حصے کا ترجمہ بھی قاضی عبدالودود نے مذکورہ مقالے میں جلد اول کے مقدمے کے بعد شامل کیا۔[7] متن کا آغاز صفحہ ا سے کیا گیا ہے اور یہ اقتباس اوران کی توضیحات پر مشتمل ہے۔ چنانچہ سرورق پر اس جلد کا موضوع ذیلی عنوان کے طور پر تحریر کردیا گیا ہے: *Extraits et Analyses*۔ متن کی ترتیب اس طرح ہے کہ پہلے اقتباس نقل کیا گیا ہے پھر اقتباس سے متعلق مزید معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ یوں یہ متن صفحہ ۶۰۴ پر مکمل ہوتا ہے۔ صفحہ

۶۰۵ سے ۶۰۸ تک فہرست مندرجات ہے۔

اس تصنیف کا دوسرا ایڈیشن خاصے اضافوں کے ساتھ 'ایشیاٹک سوسائٹی، پیرس' کے زیرِ اہتمام تین جلدوں میں شائع ہوا۔ سرورق پر "دوسری اشاعت" کے ساتھ تحریر ہے کہ "نظرثانی، تصحیح اور خاصے اضافوں کے ساتھ"۔ پہلی جلد ۱۸۷۰ء میں شائع ہوئی، جو پیش لفظ کے ۱۴ اور متن کے ۶۲۴ صفحات پر مشتمل تھی۔ متن میں ۷۰ صفحات پر مشتمل مقدمہ ہے، جس میں مصنف نے اردو زبان اور اس کے اسالیب اور اس کتاب کے مآخذ کا تعارف تحریر کیا ہے اور ذیل میں ادبی اصناف اور اصطلاحات کی تشریح کی ہے اور پھر تذکروں کا تعارف کرایا ہے، جو اس کتاب کے مآخذ کی حیثیت میں اس کے پیش نظر رہے۔ یہ تذکرے تعداد میں ۲۶ تھے۔ متن کا وہ حصہ جو صفحہ ۷۳ سے شروع ہوتا ہے، شعرا و مصنفین کے تراجم پر مشتمل ہے اور حروف تہجی کی ترتیب میں مولوی مظہر علی حضوری کے ترجمے پر ختم ہوتا ہے۔ آخر میں صفحہ ۶۱۹ سے ۶۲۴ تک محمد عاجز کے قصۂ لعل و گوہر پر وضاحتی و تنقیدی شذرہ تحریر کیا ہے، جس کا ذکر اس نے صفحہ ۶۸۔۶۹ پر متن میں کیا تھا۔ اس طرح یہ جلد صفحہ ۶۲۴ پر ختم ہوتی ہے۔

دوسری جلد بھی ۱۸۷۰ء میں شائع ہوئی جو رومن حرف I اور عبارت حاجی مرزا عابد علی بیگ زائر کے ترجمے سے شروع ہوتی ہے۔ اس میں حکیم سید عنایت حسین رسوا تک کا ترجمہ شامل ہے، جو صفحہ ۵۹۴ پر ہے۔ اسی صفحے سے مستعان شاہ مداری اور الٰہی بخش نشاط کے ذیل میں ان کی مذکور مثنویوں پر اضافی معلومات درج کی ہیں، جو صفحہ ۶۰۸ تک محیط ہیں۔

تیسری جلد ایک سال کے بعد ۱۸۷۱ء میں اسی اہتمام اور تسلسل میں شائع ہوئی۔ اس کا آغاز ایک استدراک سے ہوتا ہے، جو ۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ مصنف نے اسے ۱۵ اکتوبر ۱۸۷۱ء کو تحریر کیا۔ اس میں سابقہ دو جلدوں کے مندرجات میں حرف "ک" (k)، "و" (W) تک شروع ہونے والے مصنفین و شعرا کے تراجم مختصراً شامل کیے ہیں۔ خواتین کے ناموں کی فہرست اسی ذیل کے آخر میں شامل کی گئی ہے۔

اس جلد کا متن حرف "س" کے اولین شاعر میر سعادت علی کے ترجمے سے شروع ہوتا ہے اور صفحہ ۳۵۳ پر مولوی ذوالفقار علی کے ذکر پر مکمل ہوتا ہے۔ اس کے بعد ۳۵۵ سے ۳۷۶ تک اختتامیہ

تحریر ہے، جس میں تصحیح و اضافے کیے گئے ہیں۔اس کے بعد ضمیمے ہیں۔ضمیمۂ اول کتابوں کی وضاحتی فہرست پر مبنی ہے، جن کا ذکر متن میں بطور حوالہ یا استناد آیا ہے۔یہ ضمیمہ صفحہ ۳۷۷ سے ۴۸۸ تک، ان ہی کتبِ حوالہ کی فہرست ہے اور اسے بھی حروفِ تہجی کے لحاظ سے ترتیب دیا گیا ہے۔آخر میں مفصل اشاریے ہیں، جو اولاً اسماے رجال، صفحہ ۴۸۹ سے ۵۵۰ تک اور پھر اسماے کتب صفحہ ۵۵۱ سے آخری صفحہ ۶۰۳ تک پھیلے ہوئے ہیں۔

گارسیں دتاسی کی اسی کتاب کی دوسری اشاعت ۹۷ سال کے بعد ۱۹۶۸ء میں (فرانسیسی زبان ہی میں) نیویارک سے منظرِ عام پر آئی، لیکن افسوس کہ اس اہم تصنیف کا اب تک کوئی مکمل ترجمہ اردو یا انگریزی یا کسی اور زبان میں شائع نہیں ہوا[۸]، جو جنوبی ایشیا کے قارئین کے لیے قابلِ استفادہ ہوتا۔اس کے مقدمے اور اولین صفحات کے ترجمے ضرور ہوئے، مثلاً: اس کے مقدمے کا انگریزی ترجمہ گیتا کرشن کٹی نے *Indian Literature* (دہلی: مئی، جون ۱۹۸۴ء) میں شائع کیا۔اس کے علاوہ عزت اللہ بنگالی کے فارسی قصے گل بکاؤلی کے فرانسیسی میں گارسیں دتاسی کے تحریر کردہ خلاصے کا بھی انگریزی میں ایک ترجمہ تھامس فلپ (Thomas Phillip) نے کیا، جو ڈبلیو اے کلوسٹن (W. A. Clouston) کی مرتبہ کتاب *A Group of Eastern Romances* میں "Rose of Bakauali" کے عنوان سے شامل ہوا۔یہ کتاب لندن سے ۱۸۸۹ء میں شائع ہوئی تھی۔

افسوس یہ اہم تصنیف اپنے موضوع اور اپنی معلومات پر نہایت اہم ہونے کے باوجود ابھی تک اردو میں مکمل ترجمہ نہیں ہوئی اور جس حد تک اس کا ترجمہ ہوا وہ بھی ہنوز غیر مطبوعہ رہا۔اس کے ایک انگریزی ترجمے کا ذکر ضرور ملتا ہے کہ کسی شخص نے جو پانڈی چری میں مقیم تھا، اس کی ایک جلد کا ترجمہ انگریزی میں کیا تھا، جس کا مسودہ اس نے نواب نصیر حسین خاں خیالؔ (۱۸۸۰ء۔۱۹۳۴ء) کو ملاحظے اور اشاعت کی غرض سے بھیجا تھا۔نواب صاحب نے یہ انگریزی ترجمہ اردو میں منتقل کرنے کے لیے محمد محفوظ الحق (۱۹۰۰ء۔۱۹۴۶ء) کو دے دیا، جنھوں نے اس جلد کا ترجمہ تو نہ کیا لیکن اس کے مقدمے کا ترجمہ کر کے اسے معارف (اعظم گڑھ) میں گارسیں دتاسی کے اولین تعارف کے طور پر اگست ۱۹۲۲ء میں اور پھر مقدمے کا ترجمہ ستمبر ۱۹۲۲ء کے شماروں میں شائع کیا۔

اس تصنیف کا ایک تنقیدی مطالعہ ایک فرانسیسی اسکالر Robert Ardovin نے فرانسیسی زبان میں پی ایچ ڈی کی سند کے حصول کی غرض سے بعنوان *Critical study of Garcin de Tassy's Histoire de la Litterature Hindouie et Hindoustanie* چار جلدوں میں تحریر کیا اور ڈپارٹمنٹ اوف موڈرن یورپین لینگویجز، جواہر لال نہرو یونی ورسٹی، نئی دہلی میں پیش کر کے ۱۹۷۷ء میں پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔

اس کتاب کی تصنیف کے لیے دتاسی نے جو محنت کی ہے، جس جستجو کا ثبوت دیا ہے، اور جس لگن اور مشقت سے معلومات یکجا کی ہیں، اس کتاب کے ہر صفحے سے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔وہ جس طرح اپنے ذوق و شوق کے تحت اس کے لیے مواد اور معلومات حاصل کرتا رہا، اس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔اس نے اردو سے محبت کے ذیل میں، اپنے شوق کی تکمیل کی خاطر اور پھر اپنے مطالعے کو وسعت اور گہرائی سے ہم کنار کرنے کے لیے علمِ عروض اور بیان و بدیع تک سے واقفیت حاصل کرنے کی مخلصانہ کوشش کی کہ تقطیع کے اصولوں اور بحروں سے شناسائی کا بھی وہ جا بجا ثبوت دیتا رہا ہے اور ساتھ ہی تاریخ گوئی سے اپنی واقفیت کی مثالیں بھی اس نے پیش کی ہیں۔

مصنف نے اسی ذیل میں یہ بھی بتادیا ہے کہ کون کون سی کتابیں اس نے بالمشافہ دیکھی ہیں۔وہ اسے کس طرح حاصل ہوئیں، کس کس کے توسط سے ملیں، وہ کن کن کتب خانوں میں، قلمی یا غیر مطبوعہ، موجود ہیں اور خود اس کے ذاتی ذخیرے میں ان میں سے کون کون سی کتابیں موجود ہیں۔اس طرح ایک فہرستِ کتب اس کے کتب خانے کی ایسی بن سکتی ہے جو شاید اس فہرست میں اضافہ ثابت ہو جسے قاضی عبدالودود نے تیار کیا تھا۔[۹] اس پر مستزاد گارسیں جگہ جگہ معاصر معلومات، خصوصاً مطبوعات کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے ان اخبارات کا حوالہ بھی دیتا رہا ہے جن سے اسے یہ معلومات حاصل ہوئیں۔یہاں یہ پتا چلتا ہے کہ متعدد معاصر اخبارات بھی اس تک پہنچتے رہے جن سے اس نے راست استفادہ کیا۔اس کے ذخیرۂ کتب میں یقیناً معاصر اخبارات بھی موجود تھے جن کی حفاظت اور فہرست سازی کا شاید وہاں کسی نے اہتمام کیا ہو تو آج اس کی افادیت ظاہر ہے۔

اس زمانے میں کہ جب سیاسی عزائم کے تحت ہندوؤں میں اردو کے خلاف نفرت کے

جذبات عام ہورہے تھے یا عام کیے جارہے تھے اور ہندی کی حمایت میں خلافِ حقیقت شواہد اور دلائل پر اصرار کیا جارہا تھا، دتاسی نے اردو کی حمایت میں اپنے خیالات جس طرح اپنے مقدمے میں بیان کیے ہیں، اس سے اس کی غیر جانبداری، حقیقت پسندی اور میانہ روی کا اظہار ہوتا ہے۔اسے مذہب سے بھی خاصی دلچسپی تھی۔ وہ جن افراد کا تذکرہ کرتا ہے، اگر اسے ان کے مذہب کے بارے میں علم ہوتا ہے تو وہ یہ ضرور بتاتا ہے کہ ان کا تعلق کس مذہب سے ہے۔ اگر ایسے افراد کا وہ ذکر کرتا ہے جنھوں نے اپنا مذہب تبدیل کیا ہے، یعنی ہندو یا مسلمان سے عیسائی ہوئے ہوں یا ہندو، عیسائی و یہودی سے مسلمان ہوئے ہوں تو ایسے حوالے وہ بالعموم دیتا رہا ہے۔ان حوالوں کے ذریعے کئی طرح کے مطالعات میں ان موضوعات کے ضمن میں بھی دتاسی کی اس کتاب سے مدد لی جاسکتی ہے۔

گارسیں نے جہاں افراد کے بارے میں اپنی معلومات بیان کی ہیں وہیں ان افراد کی تحریر کردہ تصانیف کے بارے میں بتایا ہے اور یہ بھی بتادیا ہے کہ وہ مطبوعہ ہیں یا غیر مطبوعہ۔اگر مطبوعہ ہیں تو کہاں سے یا کہاں کہاں سے چھپی ہیں اور ان کے کتنے ایڈیشن اس کے علم میں ہیں۔اسی ذیل میں اس نے بالعموم مطابع کا بھی بالالتزام حوالہ دے دیا ہے جہاں سے کتاب چھپی ہے اور یہ بھی کہ اس مطبع کا مالک یا مہتمم کون ہے ؟اور یہ بھی مزید بتادیا ہے کہ اس مطبع سے اگر کوئی اخبار چھپتا ہے تو کون سا اخبار چھپتا ہے اور اس کا مدیر کون ہے۔اس لحاظ سے اگر مطابع اور اخبارات و جرائد کی کوئی فہرست مرتب کرنا ہو یا مطابع اور صحافت کی تاریخ مرتب کرنی ہو تو گارسیں کی یہ تصنیف ایک ناگزیر ماخذ ہے۔

اس اہم تصنیف کا تا حال یہ ترجمہ نصف صدی گذر جانے کے باوجود غیر مطبوعہ رہا ہے اور محض اس کا وہ مقدمہ، جسے مترجم نے تحریر کیا تھا، *Karachi University Studies* کے شمارے اگست ۱۹۶۶ء میں شائع ہو سکا تھا۔ جامعہ کراچی کے میرے مستقل یا باقاعدہ زمانۂ طالب علمی (۱۹۶۵ء۔۱۹۶۹ء) میں سننے میں آتا تھا کہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اس کی اشاعت کے لیے ''مجلس ترقی ادب'' (لاہور) اور ''مرکزی اردو بورڈ'' (لاہور) سے کوشاں تھے، لیکن معلوم نہیں کیوں یہ اہم کتاب ان اداروں سے شائع نہ ہوسکی۔اس کی ایک وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اس کا متن، جو ٹائپ شدہ ہے، دست بُردِ زمانہ اور بار بار حصولِ عکس کے (بذریعۂ زیروکس) عمل سے گذرنے کی وجہ سے مدھم ہوکر متعدد مقامات

پر پڑھنے میں دشوار ہوگیا ہے اور متعدد صفحات کا مکمل عکس بھی نہیں لیا جاسکا۔پھر کہیں کہیں ٹائپ کرنے والے نے بھی بے نیازی برتی ہے، یہاں تک کہ الفاظ چھوڑ دیے ہیں اور جملے نامکمل بھی رہنے دیے ہیں۔اشاعت کے لیے اس طرح کے متن کی تدوین اور کتابت خاص توجہ اور اہتمام کی متقاضی تھی جو شاید خود ناشر کے لیے گوارا نہ تھی اور شاید اپنی مصروفیات کے سبب خود ڈاکٹر لیث صاحب کے لیے یہ ہفت خواں طے کرنا ممکن نہ ہوا، جب کہ اس مقصد کے لیے اصل فرانسیسی متن سے ترجمہ شدہ متن کا مقابلہ ناگزیر بھی تھا تا کہ ٹائپ شدہ مسودے کی مذکورہ کمزوریوں کو دور کیا جاسکے۔

قریباً ۱۹۹۱ء کے آغاز میں شعبۂ اردو، کراچی یونی ورسٹی کے پروفیسر جمیل اختر خاں (۱۹۴۱ء۔۲۰۰۰ء) نے شعبۂ اردو کی صدارت کے دوران شعبے کے ایک تحقیقی مجلّے کی اشاعت کا منصوبہ منظور کرایا تھا اور اس مقصد کے لیے راقم الحروف کو بھی ذمے داری سونپی تھی، چنانچہ اس کے لیے مقالات کے حصول اور ان کی کتابت کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا تھا۔خود راقم الحروف نے بھی اس مجلّے کے لیے ملک اور بیرون ملک کے محققین سے مقالات حاصل کیے تھے۔مرحوم نے کتاب خانۂ محمود حسین جامعہ کراچی سے اس ترجمے کی دونوں جلدیں اس ارادے سے حاصل کی تھیں کہ یہ ترجمہ قسطوں میں اس مجلّے میں شائع کردیا جائے گا۔اس کے ایک ابتدائی حصے کو کتابت کے لیے بھی دے دیا گیا لیکن نامعلوم وجوہات کے باعث نہ یہ مجلّہ شائع ہوا نہ اس کے مقالات اور کتابت شدہ مواد کے بارے میں کچھ علم ہوا، کیونکہ راقم الحروف ایک طویل رخصت پر پہلے یورپ اور پھر جاپان چلا گیا اور یہاں کے حالات ومعاملات سے لاتعلق و بے خبر رہا۔اس ترجمے کی دونوں جلدیں، جو مرحوم کی میز پر راقم الحروف نے بار ہا دیکھی تھیں، بعد میں کہیں نظر نہ آئیں۔محض اس کی ایک جلد، اقتباس لینے کے لیے صرف ایک دن کے لیے مرحوم نے اس کا عکس بنوانے کی خاطر میرے سپرد کی تھی جو عکس بنوانے کے بعد میں نے دوسرے ہی دن مرحوم کو لوٹا دی تھی۔ کاش دوسری جلد بھی مرحوم اسی طرح ایک دن کے لیے ہی سہی مرحمت فرما دیتے تو اس کا عکس بھی بنا کر محفوظ کرلیا جاتا۔ بعد میں یہ دونوں اصل جلدیں، ایک عرصے تک جہاں جہاں امکان ہوسکتا تھا وہاں بظاہر موجود اور دستیاب نہ ہوئیں، لیکن بالآخر دوسری جلد کا عکس بھی، جو ڈاکٹر محمود حسین لائبریری کی ملکیت تھی، اس لائبریری کے ایک کرم فرما جناب

خالد حسین (پ:۱۹۵٦ء) کی جستجو کے نتیجے میں مجھے دستیاب ہوگیا تو اس تاریخ کا مکمل ترجمہ شدہ متن پیش کرنا ممکن ہوگیا۔ چنانچہ میں نے جامعہ کراچی کے اس وقت کے وائس چانسلر ڈاکٹر ظفر سعید سیفی (پ:۱۹۴۳ء) سے اس کی اشاعت کی اجازت کے لیے گزارش کی تو موصوف نے، جن کا اپنے منصب سے اخلاص، علم دوستی، نیکی و شائستگی اور دیانت کراچی یونی ورسٹی کی تاریخ میں، ان کی نظامت کے بعد کے ادوار کے لیے ایک مثال ہے، بحیثیت شیخ الجامعہ کمالِ ذوق وشوق سے اجازت مرحمت فرمادی۔

جب اس ترجمے کو مبیضہ تیار کرنے کے لیے پڑھنا شروع کیا گیا تو اس کے مسودے کی مذکورہ کیفیت کی وجہ سے یہ کام آسان نہ تھا۔خوش قسمتی سے راقم کے پاس گارسیں دتاسی کی متعدد کتابوں کے علاوہ اس تاریخ کی اولین اشاعت کی دونوں جلدیں عکسی صورت میں، جب کہ دوسرے ایڈیشن کی تینوں جلدیں اصل اور مکمل حالت میں موجود ہیں۔ چنانچہ مسودے کا، کتابت سے پہلے اور پروف خوانی کے مرحلے میں بار بار، اصل کتاب سے، جو بہت پُرانی ہونے کی وجہ سے خاصی خستہ اور بوسیدہ ہوچکی ہے اور کاغذ بھی زردی مائل ہو چکا تھا، مقابلہ خاصا دشوار ثابت ہوا، لیکن یہ مرحلہ بہر حال طے ہوا۔پھر مترجمہ نے جہاں جہاں حواشی تحریر کیے تھے یا مصنف کی چھوڑی ہوئی معلومات میں اضافہ کیا تھا، انھیں مقالے کے ٹائپسٹ کی کوتاہیوں، مسودے کی خستگی، عکس درعکس کی کوششوں کی وجہ سے متن کے قابلِ قراءت نہ رہنے کے باعث کاملاً نقل کرنا ممکن نہ تھا، اس لیے بڑی احتیاط کے ساتھ حالیہ ترتیب و کتابت کے وقت وہ حواشی مکمل یا ان کا نفسِ مضمون متن میں اس طرح شامل کر دیا گیا ہے کہ معلومات یا نفسِ مضمون متاثر نہ ہوں ۔اس طرح اس ترجمے کو معلومات کے لحاظ سے اصل فرانسیسی متن سے قدرے زیادہ مفید سمجھا جاسکتا ہے۔

اس کام میں گارسیں دتاسی سے جہاں جہاں سہو ہوا ہے، یا معلومات غلط یا تشنہ رہی ہیں، ان میں سے کچھ کی نشان دہی قاضی عبدالودود (۱۸۹۴ء۔۱۹۷۰ء) نے اپنے فاضلانہ اور محققانہ مذکورہ مقالات میں کردی تھی، کچھ کی نشان دہی خود مترجمہ نے ''تنقید و تحشیہ بر دیباچۂ مصنف'' کے تحت اور متن میں متعدد مقامات پر کی ہے، یا آغا افتخار حسین (۱۹۲۱ء۔۱۹۸۴ء) اور غلام حسین ذوالفقار (۱۹۲۴ء۔۲۰۰۷ء) نے بھی اپنی مذکورہ کاوشوں میں اپنے زیرِ بحث موضوعات کے ذیل میں ان کی طرف اشارے کیے ہیں۔

پھر دتاسی کا جو دیباچہ اس کتاب میں شامل ہے اس میں بیان کردہ گارسیں کے خیالات سے بعض مقامات پر بظاہر مترجمہ نے ''تنقید و تحشیہ'' کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے اس پر قوی گمان کیا جاسکتا ہے کہ اس میں بیان کردہ معلومات اور ساتھ ہی اسلوب دراصل ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔متن میں بھی متعدد مقامات پر مترجمہ نے اشعار نقل کرکے ان کا استناد تذکروں سے پیش کیا ہے، جسے مترجمہ کا اہتمام یا کاوش تسلیم کرنے میں تامل ہوتا ہے۔مترجمہ نے متن کے ترجمے کے ساتھ ساتھ متعدد مقامات پر حواشی بھی تحریر کیے ہیں اور کچھ اضافی اور تازہ معلومات بھی شامل کرنے کی نہ صرف کوشش کی ہے بلکہ گارسیں کے متعدد بیانات پر تنقید اور ان کی تصحیح بھی کی ہے، جو تنہا ان کی کوشش معلوم نہیں ہوتی۔پھر قلم اور تحریر کی پختگی بھی مظہر ہے کہ یہ سب مترجمہ کی کاوشیں نہیں ہوسکتیں۔

یہ ترجمہ اگر چہ دو جلدوں پر محیط تھا، لیکن افسوس ترجمے میں مترجمہ نے اختصار سے کام لیا اور مطالب اور مباحث کی تفصیلات کو حذف کر کے محض بنیادی معلومات تک ترجمے کو محدود رکھا ہے اور پھر ہندی زبان و ادب سے متعلق تمام موضوعات بھی حذف کردیے، جو اصل کتاب کا ایک شریک حصہ تھے۔اس طرح ہندی زبان و ادب سے متعلق متن کو خارج کر کے اس کتاب کے عنوان سے ہندوی کا لفظ بھی حذف کردیا جس کا بظاہر جواز موجود تھا۔واضح رہے کہ گارسیں دتاسی دیگر مستشرقین کی طرح اردو کے لیے بالعموم ''ہندوستانی'' کا لفظ استعمال کرتا رہا ہے لیکن اس نے اس زبان کے لیے جگہ جگہ ''اردو'' اور کہیں کہیں ''لشکری بولی'' اور ''ریختہ'' بھی استعمال کیا ہے۔

اس طرح کی کمزوریوں کے باوجود بحیثیت مجموعی یہ کہنے میں تامل نہیں کہ گارسیں دتاسی کی یہ تصنیف معلومات کا خزانہ ہے اور اپنے موضوعات کی حد تک جتنی معلومات شاعروں اور مصنفوں کے بارے میں گارسیں نے اس میں یکجا کردی ہیں، اس تصنیف کے وقت تک کسی اور ماخذ میں، شعرا کے ضخیم سے ضخیم تذکروں کے بشمول، نظر نہیں آتیں۔اگر چہ مصنف نے کسی مربوط تاریخ کے بجائے اس وقت تک کی عام روایت ''تذکرہ نویسی'' کے انداز میں اسے لکھا ہے لیکن اس کا تحریر کردہ طویل مقدمہ (پیش لفظ) اس انداز سے مختلف ہے۔متن میں شعرا اور مصنفین کا تذکرہ اس نے حروف تہجی کی ترتیب سے کیا ہے اور ان سے متعلقہ تمام دستیاب معلومات کو وہاں جمع کردیا ہے اور بالعموم اپنا ماخذ بھی

بتادیا ہے کہ اسے اس شخص کے بارے میں معلومات کہاں سے ملی ہیں۔ اس طرح اب کسی شخص پر کوئی مزید کام کرنا چاہے تو دتاسی کی اس تصنیف میں درج مآخذ کے توسط سے ایک رہنمائی آسانی سے میسر آسکتی ہے۔ بالعموم یہ مآخذ ہم عصر مآخذ ہیں اس لیے اور بھی اہم اور ناگزیر ہیں۔ یہ بھی ایک امتیاز اس تصنیف کا ہے کہ اس میں شامل ایک بہت بڑی تعداد ایسے شعرا و مصنفین کی ہے جن کے نام یا جن کے بارے میں معلومات نہ کسی تاریخ ادب میں اور نہ کسی تذکرے میں ملتی ہیں۔ اکثر افراد، کتابوں، مطبوعات اور مطابع کے بارے میں معلومات کے لیے یہ تصنیف واحد ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لیے ہر طرح کے معیاری مطالعے اور استناد کے لیے یہ ہمیشہ ناگزیر رہے گی۔

اس تصنیف کی اہمیت اور کمیابی کے پیش نظر راقم نے اس کا واحد اردو ترجمہ از لیلیان سیکستین نازرو برائے اشاعت مرتب کیا ہے، جو پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی کے زیر اہتمام زیر طبع ہے۔

حواشی و حوالہ جات

* سابق ڈین، کلیۂ زبان و ادب، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد۔

۱۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے، جو فرانسیسی زبان میں کامل مہارت رکھتے تھے، دتاسی کے نام کے لیے "گارسیں" تلفظ پر اصرار کیا ہے۔

۲۔ اس ضمن میں اس کے خیالات کے لیے: خطبات گارسان دتاسی (اورنگ آباد، ۱۹۳۵ء)، ص ۴۶۔۴۹ و بعدہٗ۔

۳۔ ۱۷۹۴ء میں فرانس کے مغربی ساحلی شہر مارسلیز میں پیدا ہوا۔ ۱۸۱۷ء میں پیرس پہنچ کر اس وقت کے معروف مستشرق سلوسترد ساسی (Slivestre de Sacy) کی شاگردی اختیار کی اور فارسی، عربی، ترکی زبانیں سیکھیں۔ ۱۸۲۲ء میں ادارۂ شرقیات (Societe Asiatica) کا معتمد نامزد ہوا۔ اس عرصہ میں اسے اردو زبان سیکھنے اور اس میں مہارت حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ جس کے لیے اس نے انگلستان کا سفر کیا اور وہاں انگریزوں سے یہ زبان سیکھی۔ واپس آکر ۱۸۲۸ء میں پیرس کے السنۂ شرقیہ کے اسکول میں اردو (ہندوستانی) کا استاد مقرر ہوا۔ پھر ساری عمر اسی حیثیت میں اردو تدریس و تحقیق میں منہمک رہا۔ ۱۸۷۸ء میں انتقال ہوا۔ تدفین جائے پیدائش مارسلیز ہی میں ہوئی۔

۴۔ اردو تذکرہ نویسی پر جو کتابیں لکھی گئیں، ان میں اس تذکرے پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے مثلاً: سید عبداللہ، شعرائے اردو کے تذکرے (لاہور، ۱۹۵۲ء)، ص ۶۲۔۷۱؛ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری (لاہور، ۱۹۷۲ء)؛ لیکن ان سے قطع نظر قاضی عبدالودود اور محمد محفوظ الحق کے مضامین مشمولہ گارسان دتاسی، از قاضی عبدالودود (پٹنہ، ۱۹۹۵ء)، ص ۱۵۱۔۱۸۲؛ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، "طبقات الشعرائے ہند اور مولوی کریم الدین" مشمولہ: صحیفہ (لاہور، جولائی ۱۹۶۷ء)، ص ۹۔۳۰؛ قیمتی معلومات پر مشتمل ہیں۔

۵۔ "تاریخ ادبیات ہندوی و ہندوستانی، جلد اول کی اشاعت اول" مشمولہ قاضی عبدالودود، تصنیف مذکور، ص ۳۹۔۴۲۔

۶۔ لیکن معلوم نہیں کیوں ڈاکٹر آغا افتخار حسین نے اس جلد کو ۶۴۲ صفحات پر مشتمل بتایا ہے؛ یورپ میں تحقیقی مطالعے (لاہور، ۱۹۶۷ء)، ص ۵۱۔

۷۔ قاضی عبدالودود، تصنیف مذکور، ص ۳۹۔۴۱۔

۸۔ اس کی تصانیف میں سے صرف ایک تصنیف کے انگریزی ترجمے کا علم ہوتا ہے *Memoire sur quilques particularities de la religion musulmane dans l'Inde d'apres les ouvrages hindoustani* پیرس سے ۱۸۳۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کا موضوع ہندوستانی مسلمانوں کے عقائد اور ان کی رسومات سے متعلق تھا۔ اس موضوع سے متعلق اپنی تصنیف سے قطع نظر گارسیں دتاسی نے مسز میر حسن علی کی تصنیف *Observations on the Mussulmauns of India* (مطبوعہ ۱۸۳۲ء) اور جعفر شریف کی تصنیف *Qanun-i-Islam* (مطبوعہ ۱۸۳۲ء) پر تبصرے لکھے تھے، جو پیرس کے تحقیقی مجلوں علی الترتیب *Journal Asiatique* (جون ۱۸۳۳ء) اور *Journal des Savants* (اگست، ستمبر ۱۸۳۳ء) میں شائع ہوئے۔ ان تینوں تصانیف کا ایک انگریزی ترجمہ ایم وہم نے ایک مجموعے کی صورت میں *Muslim Festivals in India and other essays* کے عنوان سے کیا جو دہلی سے ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا۔ مترجم نے اس ترجمے کو مفید بنانے کے لیے حواشی بھی تحریر کیے اور آغاز میں ایک مبسوط مقدمہ لکھ کر گارسیں دتاسی اور اس کی تصانیف کے تعلق سے مفید معلومات یکجا کیں۔ اس مترجم نے گارسیں دتاسی کا اسی سلسلے میں ایک مقالہ *...Notice sur les fetes des Hindus* جو اس نے ہندوؤں کے عقائد و رسومات کے تعارف میں تحریر کیا تھا، اور *Journal Asiatique* فروری اور مارچ ۱۸۳۴ء شائع ہوا تھا، انگریزی میں ترجمہ کیا اور جوان ہی کے مرتبہ ایک مجموعۂ مقالات *On becoming an Indian Muslim* مطبوعہ دہلی ۲۰۰۳ء میں بطور ضمیمہ "Notice on the fetes of Hindus according to Hindustani Works" کے عنوان سے شائع ہوا۔ ایم وہم کے علاوہ کمال ابداولی نے حالیہ عرصے میں دتاسی کے بعض اہم مقالات کو، جو اس نے اردو زبان و ادب کے تعلق سے لکھے تھے، اپنے مطالعے کا موضوع بنایا ہے اور ان کے ترجمے بھی انگریزی میں کیے ہیں۔ دتاسی کا ایک مقالہ: *La Langue et la Litterature Hindoustanie*، جسے دتاسی نے ۱۸۷۴ء میں تحریر کیا تھا، "Hindustani Language and Literature" کے عنوان سے کیا جو *Annual of Urdu Studies* کے شمارہ ۲۶، ص ۱۳۵۔۱۲۶ میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ دتاسی کی تصانیف: *Auteurs Hindoustanis et Levres Orange* اور *Auteurs Hindoustanis et Levres Ouvrages d'apres le Biographies Originale* کے ترجمے مولوی ذکاء اللہ دہلوی اور ڈاکٹر ریاض الحسن نے کیے تھے، جن کا حوالہ سطور بالا میں آچکا ہے، کمال ابداولی نے بھی ان کے ترجمے کیے ہیں جو *Annual of Urdu Studies*، شمارہ ۲۸، ص ۶۲۔۱۳۸ میں بعنوان: "The Hindustani Authors and their Works as Described in the Primary Biographies"، شمارہ ۲۸، ص ۶۰۔۱۳۸ میں شائع ہوئے ہیں۔

۹۔ "فہرست کتب خانۂ گارساں دتاسی"، مشمولہ: نوائے ادب (بمبئی)، جنوری ۱۹۵۸ء؛ و نیز مشمولہ: قاضی عبدالودود، گارساں دتاسی، محولہ بالا، ص ۱۱۵۔۱۳۰؛ دتاسی کی تقریباً تمام تصانیف اب "فرانچ نیشنل ڈیجیٹل لائبریری" (French

National Digital Library) کے اہتمام سے اس شق : http://galilca.buf.fr، پر موجود اور قابل مطالعہ ہیں۔

مآخذ

دتاسی، گارسیں۔ خطبات گارساں دتاسی۔ اورنگ آباد ۱۹۳۵ء۔

ذوالفقار، غلام حسین۔ "طبقات الشعرائے ہند اور مولوی کریم الدین"۔ مشمولہ صحیفہ لاہور (جولائی ۱۹۶۷ء)۔

حسین، آغا افتخار۔ یورپ میں تحقیقی مطالعے۔ لاہور ۱۹۶۷ء۔

عبداللہ، سید۔ شعرائے اردو کے تذکرے۔ لاہور ۱۹۵۲ء۔

عبدالودود، قاضی۔ گارساں دتاسی۔ پٹنہ ۱۹۹۵ء۔

________۔ "فہرست کتب خانہ گارساں دتاسی"۔ مشمولہ نوائے ادب بمبئی (جنوری، ۱۹۵۸ء)۔

فتح پوری، فرمان۔ اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری۔ لاہور ۱۹۷۲ء۔